اظہر جاوید

طارق عزیز کے لیے تنویر ظہور نے جو تقریب منعقد کی تھی۔ اس میں عبدالعزیز خالد جیسے بڑے شاعر نے صدارت کی۔ اور یوں اپنی روشن ضمیری کا ثبوت دیا۔ اور بغیر کسی تکلف اور تردّد کے اس کی ہمتوں کا اعتراف کیا۔

دیتا ہوں داد ہمتِ طارق عزیز کی
طے جس نے کیں منازلِ عرفان و آگہی

کسی نے کشور ناہید سے کہا (ڈاکٹر وزیر آغا کی عید ملن پارٹی میں) "تم جو اتنی گفتگو میں وقت ضائع کرتی ہو۔ اس سے تو بہتر ہے۔ عبدالعزیز خالد پر ڈاکٹریٹ ہی کر لو!" کشور نے ترت جواب دیا: "مجھے ان کی شاعری سمجھ آئے تو یہ عذاب بھگتوں!" انور سدید نے صاف گوئی سے کام لیا "تو کیا ڈاکٹریٹ کے لیے موضوع کو سمجھنا بھی ضروری ہے؟"

——— اس دوران عبدالعزیز خالد بھی نشانے پر رکھے گئے۔ کشور ناہید نے کہا کہ خالد صاحب آپ بھی اپنی گارمنٹس کارپوریشن کی طرف سے کوئی تقریب کروائیں اور جیسے شہزاد احمد نے اہل قلم کو پکی پکائی روٹیوں کے پیکٹ بھجوائے تھے۔ آپ سلے سلائے کپڑوں کے تحائف دیں۔

جب خالد نے کسی طرح بھی ہاتھ نہ پکڑایا تو کشور نے جل کر کہا: کہ آپ دو دو گز کی غزلیں تو دے دیتے ہیں۔ چار گز کا سوٹ نہیں دے سکتے؟

جرمنی سے آئی ہوئی صحافی خاتون سلمیٰ جبیں نے جب ایک عید ملن پارٹی کا ذکر سُنا تو حیرت سے پوچھا:

"کیا یہاں ابھی تک ادیب انہی پُرانی روایتوں میں چمٹے ہوئے ہیں۔؟"

کشور ناہید نے بہت اچھی بات کی کہنے لگی:

"اس مشینی دَور اور بھاگتے دوڑتے وقت میں جب ہر انسان نفسا نفسی اور آپا دھاپی میں پھنسا ہوا ہے چند لوگ اگر آپس میں بیٹھ کر باہمی دکھ سکھ کی بات کر لیں تو یہی بہت کمال ہے... ع

غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

یہ تقریب ملاقات ڈاکٹر وزیر آغا کی طرف دی گئی دعوت کے سلسلے میں تھی۔ ایک دو برسوں سے وزیر آغا ایک نئی روایت مرتب کر رہے ہیں۔ گزشتہ عید ملن پر چائے تھی، اس بار کھانے کا اہتمام کیا گیا تھا اور اس میں اضافہ انور سدید کا بھی تھا جو خصوصاً سرگودھا سے شرکت کرنے آئے تھے۔ اس دعوت کی سُن گن لگی تو شہزاد احمد نے پوچھا:

"مدعوین کون کون ہیں؟"

جب پچھلے برس کی تقریب والے دوستوں کا نام ہی گنوایا گیا تو شہزاد نے گرہ لگائی:

"عبدالعزیز خالد تو نہیں ہوں گے؟"

ان دنوں عبدالعزیز خالد گارمنٹس کارپوریشن میں تھے جس پر کشور ناہید نے پھبتی کسی کہ خالد صاحب آپ بھی کبھی کوئی ایسی تقریب کر ڈالیں۔ آپ رسائل و اخبارات کو گز گز بھر کی غزلیں نظمیں تو بھیج دیتے ہیں مگر گارمنٹس کارپوریشن کے مال کا صحیح مصرف نہیں کرتے!"

انعام الحق جاوید

عبد العزیز خالد کا مصرع

ع میں شام کا عاشق ہوں بھاتی ہے مجھے شام

جس طرح سچے اور کھرے تجربوں پر مبنی ہے۔ اسی طرح ان کے ساتھ منائی جانے والی شاموں کا شمار بھی بساطِ فکر سے باہر ہے۔

خود میں نے ایک دفعہ عبد العزیز خالد کا انٹرویو لیتے ہوئے ان سے درخواست کی تھی کہ حضور! اب تو سب مان چکے ہیں کہ آپ نے فن مشکل گوئی میں سپیشلائز کیا ہوا ہے اور جینئس اریب ہیں۔ خدارا اس پاک دامن پارکر کی جگہ عوامی ایگل خرید لیجئے کہ آپ کی تحریروں کا ابلاغ ہم جیسے عوام تک بھی ہو سکے۔ انہوں نے کوہ ہمالیہ پر سے گفتگو کرتے ہوئے فوراً جواب دیا تھا کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے میں ہی نیچے کیوں اتروں کچھ عوام کو بھی کوہ پیمائی کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ذرا وہ آگے بڑھیں ذرا میں قدم اٹھاؤں تو تب ہی شیک ہینڈ ہو سکتا ہے۔ یہ سن کر میں دیر تک سوچتا رہا تھا کہ عوام ادب عالیہ کا مطالعہ فرمائیں۔ یا دو وقت کی روٹی کمانے کے چکر میں دن رات گھومیں گھمائیں۔

بشیر نیاز

کراچی کی گپ شپ

انھی گرمیوں کے ایک دن میں اور جون ایلیاء (جو عربی اور عبرانی سے ناقابلِ معافی حد تک متاثر ہے) شاعر عبد العزیز خالد کے ہاں جا رہے تھے۔ جون ایلیا بتا رہا تھا — "جب ملک بٹا کمال بھائی (مشہور فلم ڈائرکٹر) نے کہا بمبئی چلو۔" میں نے جواب دیا "وہاں بھی سڑکیں ہیں۔ سوندھی سوندھی مٹی سے وہ جو ایک رشتہ ہوتا ہے ناٹوٹ جائے گا، انسان مر جائے گا مجھے اس کی بڑی ضرورت ہے۔" پھر کہنے لگا: "ایک بار میں ایک سادھو کے پاس گیا تھا۔ میں نے کہا مجھے نامرد کر دو۔ مجھے مطالعے میں بڑی پریشانیاں ہوتی ہیں۔ میرے عزیزوں نے کوشش کی کہ میری شادی ہو جائے، میں نے ایک ہی جواب دیا۔ میرا کرب ختم ہو جائے گا۔" بس میں دم گھٹنے کی گھمس تھی۔ اور جون لگاتار کہ رہا تھا۔

"ایک انسان (جس کی زیادہ سے زیادہ عمر پچپن برس ہو گی) کی تربیت کے لیے تو ایک بی۔اے۔بی۔ٹی کی ضرورت ہے۔ مگر ثقافتی اقدار جو صدیوں نہیں مرتیں اُن کی پرورش کے لیے کوئی سند درکار نہیں۔ اُردو میں تو ساتوں خون معاف ہیں۔"

میں اور جون ایلیاء (جس کا خیال ہے کہ ایک جاہل آدمی اگر میٹروپول میں ناچتا ہے تو ایک عالم کیوں نہ ناچے) دونوں شاعر عبد العزیز خالد کے گھر پہنچے۔ عبد العزیز خالد وہ شاعر ہے جس کی کتنے ہی پرچوں میں کئی کئی صفحوں پر نظمیں چھپتی ہیں اور لوگ اپنا کٹرپن چھوڑ کر اب واقعی اسے سنجیدگی سے پڑھنے لگے ہیں۔ خود اس کا خیال ہے کہ اب لوگوں میں کلاسیکت کو پسند کرنے کا دور آ گیا ہے۔ ہمارا عہد بڑا پُر اُمید ہے۔ اب بہت سی کتابیں طاقچوں پر سے اُتار لی گئی ہیں۔ اور لوگوں نے انھیں پڑھنا شروع کر دیا ہے۔ مجھے خالد سے شکوہ تھا کہ شہروں کی جیتی جاگتی گلیوں کو چھوڑ کر پرانے عبرانی قصوں میں کیوں گم ہوتا ہے۔ اس پر سب سے پہلے جون ایلیاء نے ہی بولنا شروع کیا۔

"صاحب ادب کا کام ہے قدریں دینا۔ بنیادی غلط فہمی یہ ہے کہ ادب اور سائنس میں بُعد تصور کر لیا گیا ہے۔ خالد مثالی کردار کیوں دیتے ہیں؟ وہ یہ کردار ایک قدر متجسّم کرنے کے لیے لاتے ہیں۔ شاعری کا بنیادی عنصر ہے۔ عظمت، آپ اسے تصوریت بھی کہ سکتے ہیں۔

"لیکن سوال یہ ہے کہ ہم زندوں سے نظریں پھیر کر "خفتگانِ خاک" کو کیوں نمائندگی دیں؟" میں نے پھر شوشہ چھوڑا۔ جون ہی بولا — "تاریخ کا یہ المیہ ہے کہ ہم سامنے کے کرداروں کی عظمت کا اعتراف نہیں کرتے۔ ان سے صرف ہمدردی یا محبت کرتے ہیں۔ دراصل اپنے عہد کی شخصیتوں کو ذہن ہضم نہیں کر پاتا۔ ادب اپنی تفسیر آپ ہوتا ہے فٹ نوٹ نہیں رکھتا۔ اور پھر یہ معاملہ نفسیاتی بھی ہے۔ خالد چاہیں تو اپنی نظم کا ہیرو نوصبا کو بھی بنا سکتے ہیں۔ مگر یہ اسی کردار کو سقراط کے روپ میں پیش کرتے ہیں، بات ایک ہی ہے شخصیت جب تک زمانے میں گھل مل کر آئے وہ شخصیت نہیں بن سکتی۔ شخصیت کو پہلے تو ماضی کے حوالے کر دیجئے اور پھر اُسے ادب میں لے آئیے۔"

"لیکن خالد صاحب اگر آپ سلومی کے بجائے کسی بھکارن کو نظم کی ہیروئن بناتے تو وہ زندگی سے قریب تر نہ ہوتی۔ سلومی کو تو ہم نے دیکھا تک نہیں۔ میں نے خیال ظاہر کیا۔

عبدالعزیز خالد۔ میری سلومی، سلومی نہیں وہ ایک جوان عورت کا جسم ہے جو ہوسناک ہے۔"

جون ایلیاہ — "شاعر کو پروگرام کا پابند نہ کیجئے۔ یہ مشینی چیز نہیں۔ یہ تو ذہنی عمل ہے کہ اُسے بیتا کے بجائے سلومی زیادہ اپیل کرتی ہے۔

عبدالعزیز خالد — "میرا موضوع انسان کا داخلی مطالعہ ہے۔"

جون ایلیاہ —۔ "ان کی قابلِ توجہ بات ان کی ہیئت ہے۔ دلی سے لے کر غالب تک میں "ڈکشن" کا فرق نمایاں نہیں ایک یکسانیت ہے۔ خالد میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کا لہجہ پہچانا جاتا ہے۔ ادب میں الفاظ ڈکشنری سے نکل کر نہیں آتے بلکہ اُن کی حیثیت نامیاتی ہوتی ہے۔"

"جون ایلیاہ صاحب خالد پر تو آپ اتھارٹی کا درجہ رکھتے ہیں۔ اچھا اب آپ ہی بتائیے کہ اُردو نظم میں ان کی شعوری کوشش کیا ہوتی ہے؟" — میں نے پوچھا۔

جون ایلیاہ — "اُردو غزل میں اپنے کنوارپن کے باعث سراپا کا اظہار نہیں ہو سکتا تھا۔ مثال کے طور پر اب تک کوئی پیٹ کی تعریف نہیں کر پایا تھا۔ شعر کہنے والوں نے زیادہ سے زیادہ۔

ع مرغ دل کو پھاڑے ہے بلّی تمھارے ناک کی

کہا تھا یا ؎

کسی کے محرم آبِ رواں کی یاد آئی
حباب کے جو مقابل کوئی حباب آیا

سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ہماری زبان عورت کی ناف سے نیچے نہیں اُترتی یہاں اہمیت بس سینے۔ کولہوں اور پنڈلیوں کی ہے۔ نابالغوں اور نامردوں کا سا انداز ہے۔ اس میں وہ پرستی ہوئی دوشیزگی نہیں اُبھرتی۔ اگر بہت خون پسینہ

کیا جاتا ہے تو کوک شاستر بن جاتا ہے جو ناقابلِ اشاعت ہے۔ خالد نیم رُخ نہیں قدِ آدم تصویر کھینچتے ہیں۔"

عبدالعزیز خالد (یونان کی "ریحاں نفس و لالہ رُخ و سنبل مو" والے) اُنھوں نے اُردو نظموں کی کوئی کتاب لکھی ہے۔ اور یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ یہ ——— "نظمیہ غزلیں" ہیں یا "غزلیہ نظمیں" ——— بہرحال ان میں مغربی شاعری کے "فری ایسوسی ایشن آف تھاٹ" والی بات ہے۔ ان میں غزلیہ پن اس لیے ہے اس میں وہ جب چاہا بات شروع کر دیتے ہیں (یہ مشکل نہیں کہ نظم کی طرح اگر آنکھوں کی تعریف کر رہے ہیں تو انھیں اس میں "آرمڈ فورسز" کا تذکرہ کرنے کی آزادی نہیں)

خالد دیومالائی قدریں اس لیے لیتے ہیں کہ اس سے کسی کو اختلاف کی کم گنجائش ہوتی ہے۔ اب براہِ راست تو ہو گیا ہے یہ فکری سطح پر مسائل حل کرتا ہے۔"

اُنھوں نے اپنے مخصوص لہجے میں بات یوں سمجھائی کہ ———

مغربی شاعری میں ایک چیز ہوتی ہے ——— "Mythical Method" یا اساطیری منہاج ایلیٹ، جیمز جوائس، ایزرا پاؤنڈ کے ہاں پایا جاتا ہے ——— ان کے ہاں فرق یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنی تہذیب کو "کوٹ" کیا ہے۔ اُنھوں نے بچوں اور کتابوں کے نام رکھنے "پرابلم" کا بھی "کریہ" بتایا ——— کہنے لگے۔

"کئی دنوں بعد ایک مصرع میں نے پڑھا ——— "پریشاں می نویسد کلکِ موج احوالِ دریا۔"

میں اُچھل پڑا (یہ میں نے اپنی طرف سے لکھا ہے) ——— کتاب کا نام ——— "کلکِ موج" رکھ دیا۔

کچھ اسی قسم کی کیفیت کے ساتھ اُنھوں نے اپنی "زیرِ زیورِ طبع" کتاب "ورقِ ناخواندہ" کا نام رکھا۔ ہوا یوں کہ ایک شعر اُنھوں نے پڑھا۔

کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہمدیگر سے
ہے ہر اک فردِ جہاں میں "ورقِ ناخواندہ"

وہ مارا ——— (ویسے یہ لفظ میں نے خود لکھا ہے ——— کیونکہ اس موقع پر یہ میلو ڈرامائی صورت پیدا کرنا ضروری ہے ———

اگر دیکھا جائے تو وہ بڑا ہی مشہور ——— "روبنسن کروسو" والا کردار کر رہے ہیں ——— (عزلت گزینی) بولے ———

"اَدیب باتیں کرنے سے نہیں بنتا، بندرگاہ کی کامیابی کے لیے ساحل کا کٹا پھٹا ہونا اور علاقے کا زرخیز ہونا ضروری ہے۔ یہی بات شاعری مانگتی ہے۔ جو سنی کے بل پر نہیں چلتی۔ جو لوگ کچھ اور طرح کی باتیں

۱۔ اپنی تہذیب اور ادب کی کلاسوں سے بھاگے ہوئے لوگ ہیں جو انگریزی ادب کے مجموں میں کھڑے رہے ہیں۔ عمریں کچی تھیں۔ کچھ سمجھ نہ پائے اور اس طرح کی باتیں کہنے لگے۔

جیسے اپنے سرمائے سے "محجوب الارث" ہوں ــــــ"

پھر بڑے ہی اساطیری لہجے میں بولے ــ

"مطالعہ بھی تخلیقی ہوتا ہے۔ ہم نے مطالعہ بھی تخلیقی نہیں کیا۔ ذہن میں خیالات و جذبات کا اُبال اُٹھتا ہے۔ نہیں جانتے کیسے ڈھلے' ــــــــ میرا یہ شعر داد طلب نہیں۔

لیکن تم سنو ــــــ میں نے وہ شعر سنا اور وہ یہ تھا۔

پیرویٔ مغربی میں نہ کر فراموش ــــــ تیرا نظامِ تلازمات جدا ہے

اور اس موضوع پر یہ آخری جملہ تھا ــــــــــــ

"ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ نظامِ تلازمات اپنا لائیں ــــــ؟

افضل آرش

عبد العزیز خالد کی نعت میں جو سوز و گداز اور کیف و مستی کی کیفیت ہے۔ وہ دوسرے بہت کم نعت گویوں کو میسّر ہے۔ اُردو زبان پر انھیں کامل قدرت ہے۔ شاید اس لیے کسی نے کہا تھا اور درست کہا تھا کہ

اُردو زبان کا والد
عبد العزیز خالد

اور اَب تو ان کی معنوی اولاد میں شاید عربی کے علاوہ پنجابی زبان بھی آنے والی ہے۔ کیونکہ آج کل پنجابی زبان میں ان کی تخلیقات پوری توانائی کے ساتھ سامنے آ رہی ہیں۔ ہماری کلاسیکی پنجابی شاعری میں جتنے شاعر بھی گزرے ہیں۔ وہ پہلے عالم اور بعد میں شاعر تھے۔ لیکن موجودہ پنجابی شاعری میں۔ یہ معاملہ بالکل اُلٹ ہے۔ اور شاعری میں اس قسم کی واحد مثال عبد العزیز خالد کی ہے۔

عبد العزیز خالد کی نعت کی ایک بہت بڑی خوبی ان کا عجز و انکسار ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ حضورؐ کا ذکر کرتے ہوئے جس قدر وہ اپنے آپ کو جھکاتے ہیں۔ حضورؐ کی رحمت اور محبّت کے صدقے ان کے درجات اتنے ہی بلند ہو رہے ہیں۔ ذرا اپنے ارد گرد نظر ڈالیے۔ تو پتہ چلے گا کہ جتنا عبد العزیز خالد پر لکھا گیا ہے۔ شاید ہی کسی شاعر پر لکھا گیا ہو۔ اور بلاشبہ اس کے حق دار ہیں۔ اتنا بڑا شاعر کہ جس کے آگے لفظ دست بستہ کھڑے رہتے ہیں۔

——— ان کی نعت گوئی نے دراصل دوسرے شاعروں کو نعت لکھنے کا حوصلہ اور سلیقہ بخشا۔ اور موجودہ دور کو نعت کا دَور بنانے میں ان کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ اپنی نئی کتاب " طاب طاب " کا انتساب اُنھوں نے اپنی بہت بڑی عقیدت مند محترمہ عفّت موہانی کے نام کیا ہے۔

عفّت موہانی ہندوستان کی خود بہت معروف افسانہ نگار ہیں۔ اور مولانا حسرت موہانی کی پوتی ہیں۔ وہ خالد صاحب کی شخصیت اور فن کی کس قدر پرستار ہیں۔ اس کا اندازہ صرف ان کے خطوط سے لگایا جا سکتا ہے، جو وہ باقاعدگی سے خالد صاحب کو لکھتی ہیں۔

جالندھری بنام جالندھری

جناب عبدالعزیز خالد بھی جالندھری ہیں۔ یہ ان کے ایک حالیہ اخباری انٹرویو سے معلوم ہوا۔ بیدار سرمدی نے جب ان سے یہ سوال کیا کہ:

"حفیظ جالندھری نے ایک بیان میں کہا ہے کہ ہندوستان میں پاکستان سے بہتر شاعری ہو رہی ہے۔"

اس بیان پر آپ کا ردِ عمل کیا ہے؟ جناب عبدالعزیز خالد نے برجستہ جواب دیا:

"قبلہ حفیظ صاحب آج کل جو لکھ رہے ہیں یقیناً بھارت میں اس سے بہتر لکھا جا رہا ہے۔"

فیض کا سرقہ

فیض کا ایک مشہور مصرعہ ہے ؎

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر

جو اُنھوں نے آزادیٔ ہند کے تعلق سے علامت کا سہارا لے کر کہا تھا۔ اس کے پس منظر میں اشتراکی روسی رویّہ موجزن تھا جس کے تحت اُنھوں نے آزادی کو ایسے اجالے سے تعبیر کیا تھا جو داغ داغ ہے۔ فیض اور ان کی قبیل کے ترقی پسند شاعروں نے آزادی کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ اس خیال کے تعلق سے ان دنوں کئی نظمیں منظرِ عام پر آئی تھیں۔ فیض کے مذکورۂ بالا مصرعہ نے اس قسم کی شاعری میں بہت زیادہ شہرت پائی تھی۔ لیکن افسوس فیض کے دیگر نظریات

کی طرح ان کا یہ مصرعہ بھی غیروں سے مستعار لیا گیا تھا۔ عبدالعزیز خالد نے ایک دور کی کڑی تلاش کی ہے۔ ان کی جستجو کی رو سے فیض کا مذکورہ بالا مشہور مصرعہ کا ہو بہو عکس ہے۔

This night bitten morn, this spotted light

W B Yeats

عبدالعزیز خالد نے پنجابی میں شاعری کر کے لاہور کے پنجابی زبان کے ادبی حلقوں میں ایک نیا ولولہ پیدا کر دیا ہے کہیں ان کی صدارت میں پنجابی مشاعرہ ہو رہا ہے۔ تو کہیں تنقیدی اجلاس کی صدارت۔ پچھلے دنوں لاہور ٹی۔ وی نے آپ کو پروگرام "پنجسند" میں مدعو کیا۔ یوسف کامران کے ایک سوال کہ "آپ پنجابی کی طرف کیوں آئے؟" کے جواب میں جناب عبدالعزیز خالد نے کہا:

"ہر شاعر کی دو مائیں ہوتی ہیں۔ ایک جو اسے اپنی کوکھ سے جنم دیتی ہے اور دوسری جو اسے پالتی ہے۔ دونوں کے اپنے حقوق ہوتے ہیں اور دائرہ کار الگ الگ۔ ایک اس مٹی کی زبان جس میں جنم لیتے ہیں اور دوسری تہذیبی زبان جسے قوم کی نمائندہ زبان کہتے ہیں۔ دونوں زبانوں کا دائرۂ کار الگ الگ ہوتا ہے۔ قرآن کی ایک ایک آیت کے مطابق

كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ

اجرامِ فلکی سب اپنے اپنے دائروں میں گھومتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی زمین کی دو گردشیں ہیں۔ ایک زمین کی اپنے گرد اور دوسری سورج کے گرد۔ پہلی گردش سے رات دن پیدا ہوتے ہیں۔ اور دوسری گردش سے موسم پیدا۔ اور دوسرے تغیرات رونما ہوتے ہیں۔ دونوں زبانوں (اُردو اور پنجابی) میں کوئی محاذ آرائی ہے نہ ہونی چاہیئے۔ دونوں کا دائرۂ اختیار الگ الگ ہے۔ اور اس میں کسی قسم کے ٹکراؤ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

چلتے چلتے ایک بات جو ہم خاص طور پر قارئین سے عرض کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ آئندہ خالد صاحب آسان اور سادہ زبان میں شعر کہا کریں گے۔ اُنھوں نے بتایا کہ مشکل زبان میں شعر لکھ کر "کیوں اپنے آپ نوں تے اپنے قاری نوں اوکھا کریے؟" آسان اور سادہ زبان میں اُردو میں شاعری کرنے کا فیصلہ کر کے اُنھوں نے بے شک اپنے قارئین پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ خدا انھیں اس کڑی آزمائش میں پورا اُترنے کی توفیق دے۔

حضرت حفیظ جالندھری سے چند دنوں ایک انٹرویو کرنے والے نے عبدالعزیز خالد کے بارے میں ان کی رائے پوچھی، تو فرمانے لگے:

"عبدالعزیز خالد شاعروں میں عالم ہے۔ ایسا علم جسے علم کا استعمال کرنا آتا ہے۔ وہ لفظ کو جہاں چاہتا ہے۔ رکھ دیتا ہے۔ اور پھر کوئی اس لفظ کو وہاں سے نہیں اُٹھا سکتا۔"

ایک معاصر روزنامہ میں معروف افسانہ نگار غلام عبّاس کا انٹرویو شائع ہوا ہے۔ غلام عبّاس صاحب نے اپنے انٹرویو میں بتایا ہے کہ:

"۱۹۵۰ء کے بعد پاکستان میں کیا دنیا میں کہیں بھی بڑا ادب تخلیق نہیں ہوا ہے۔ مزید یہ کہ

سرکاری ملازمت میں رہتے ہوئے جتنا کام میں نے اور ن۔م راشد نے کیا ہے اور کسی نے نہیں کیا۔"

غلام عبّاس صاحب کی پہلی بات تو اس لحاظ سے ٹھیک ہے کہ وہ اپنا مقبول اور مشہور افسانہ "آنندی" ۱۹۵۰ء سے پہلے تحریر کر چکے تھے۔ اگر وہ یہ کہانی ۱۹۵۰ء کے بعد لکھتے تو شاید انھیں دنیا میں اور پاکستان میں بڑا ادب نظر آجاتا۔

رہی سرکاری ملازمت میں رہ کر بہت زیادہ کام کرنے کی بات۔ تو غلام عبّاس صاحب کا بڑا کام یہ ہے کہ موصوف نے اپنی طویل زندگی میں صرف ۵۰ کہانیاں لکھی ہیں۔ سرکاری ملازمت میں رہ کر اگر کسی شخصیت نے کام کیا ہے تو وہ عبدالعزیز خالد ہیں۔

گزشتہ دنوں عبدالعزیز خالد سے ایک صاحب نثری نظم پر رائے لینے کے لیے آئے۔ خالد صاحب نے نثری نظم کے بارے میں فی البدیہہ یوں رائے دی:

لیکن اس کا نام نثری نظم کیوں؟
شاعرانہ نثر پارہ کیوں نہیں؟

اکرام چغتائی گویا ہوئے:

"اُستاد! کیا آپ نے اپنی کتاب (فصلِ سلاسل) بک اسٹالز پر بھجوائی ہے کہ نہیں؟"

احسان دانش بولے:

"ہرگز نہیں۔ میری کتاب اپنے خریدار خود پیدا کرے گی۔ اور وہ میرے گھر آکر یہ کتاب خریدیں گے۔"

پتہ چلا ہے کہ عبدالعزیز خالد نے احسان دانش سے کتاب منگوائی اور اُنھوں نے بھیج دی۔

آئینۂ ادب لاہور کے شیخ عبدالسلام کے نام ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ایک خط میں بہت سی نجی باتیں لکھی ہیں۔ چند باتیں جو ڈاکٹر صاحب نے عبدالعزیز خالد کے بارے میں لکھی ہیں۔ سنیئے:

"ماذ ماذ" اور "ثانیِ لاثانی" سے چہرہ دمک اُٹھا۔ آنکھیں روشن ہوگئیں۔ اور قلب نے توانائی محسوس کی۔ خالد کا ذہن، خالد کی عاشقانہ طبیعت، ان کا خلوص، جذبات اور قلم کی نفاست و پاکیزگی سب سے لطف اندوز ہوا۔ خاص طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اُنھوں نے جس والہانہ انداز سے کیا ہے۔ اس سے دل بھر آیا۔ کبھی آنکھیں غمناک ہوئیں۔ اور کبھی خالد کی صحت و عمر کے لیے ہاتھ اُوپر اُٹھ گئے۔"

علی گڑھ یونیورسٹی شعبۂ عربی کے سربراہ ڈاکٹر مختارالدین احمد آرزو نے جناب عبدالعزیز خالد کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

"جس طرح میں اپنے طالب علموں سے اصرار کرتا ہوں۔ کہ وہ سبعۂ معلقہ، دیوانِ حماسہ، دیوان متنبّی کے کچھ قصائد، ابوتمام، بحتری اور بعض غزل گو شعراء کے منتخب مقطوعات زبانی یاد کریں اس طرح میں انھیں مشورہ دیتا ہوں۔ کہ آپ کا مشہور نعتیہ قصیدہ حفظ کریں۔ تاکہ ان کے پاس خوبصورت الفاظ کا اچھا ذخیرہ محفوظ رہے۔ ان کے طریقِ استعمال سے بخوبی واقف ہو سکیں۔ اس کے ساتھ اگر وہ اس قصیدہ کے مفاہیم و مطالب سے آگاہی حاصل کر سکیں اور اشعار سے لطف اندوز ہو سکیں تو کیا کہنا؟"

ڈاکٹر صاحب کی رائے سر آنکھوں پر۔ ہماری ناچیز رائے میں اگر "طرقِ استعمال" کی جگہ "ترکِ استعمال" ہوتا۔ تو زیادہ بہتر ہوتا۔

---

۱۴ اگست کی شان کو دوبالا کرنے کے لیے معروف دانشور فضل من اللہ نے اپنے گھر میں ادیبوں کو آموں کی ایک شاندار پارٹی دی۔ اس پارٹی میں عبدالعزیز خالد، تحسین فراقی، حفیظ الرحمٰن احسن، جعفر بلوچ اور طاہر شادانی شریک ہوئے۔ عبدالعزیز خالد کی تقریباً یہ عادت سی بن گئی ہے کہ وہ اچھا لکھنے والے کی تعریف کیے بغیر رہ نہیں سکتے۔ نیا لکھنے والا جونیئر ہو یا سینئر اُن کے مداحوں میں ہو یا اُن کے مخالفوں میں۔ ان کا کام ہر لکھنے والے کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی اُنھوں نے حفیظ الرحمٰن احسن کو مخاطب کر کے کہا: "حفیظ صاحب! جعفر بلوچ آج کل بہت اچھے شعر کہہ رہا ہے۔ اگرچہ یہ ہمیشہ میرے خلاف لکھتا رہتا ہے!" جناب حفیظ نے برجستہ جواب دیا:

"شاید آپ کے اختلاف ہی کی وجہ ہے کہ یہ بہت اچھے شعر کہتا ہے!"

اور جناب خالد سمیت حاضرین نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

عبدالعزیز خالد

اتنی محنت شاید ہی کسی شاعر یا فنکار نے کی ہو

اسلم کمال کے اعزاز میں مدیر نقوش کے عشائیے میں ہماری ایک جانب عبدالعزیز خالد تھے دوسری جانب قتیل شفائی ایک صاحب نے خالد سے پوچھا آج کل آپ کہاں متعین ہیں ۔ وہ بولے ایک ہفتے کے اندر اندر ریٹائر ہو رہا ہوں ہم بھونچکے سے رہ گئے سوچا علم کی خدمت کو تسلیم کرتے ہوئے حکومت نے انہیں پچیس سال کی سروس کے بعد ریٹائر کر دیا ہوگا اس لئے ہم نے حیرت سے پوچھا اس عمر میں ریٹائرمنٹ ؟ وہ بولے میں ۱۵ جنوری ۸۰ء کو ساٹھ سال کا ہو جاؤں گا ۔ ہم نے قدرے تاسف سے کام لیتے ہوئے کہا گویا اب کاکے بھی ریٹائر ہونے لگے ہیں ۔ انھوں نے زور کا قہقہہ لگایا لیکن ظاہر ہے دل میں خوش ہوئے ہوں گے کہ جوانی کی سند مل گئی اس وقت ہم واقعی سوچ رہے تھے کہ اتنے تجربہ کار انکم ٹیکس کمشنر کو ریٹائر کر کے حکومت نے کچھ کھویا ہے یا نہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ہم نے انہیں مبارکباد دی آج کے دور میں نیک نامی سے ریٹائر ہونا بھی خوش نصیبی ہے کیونکہ ہمیں بھی ۱۹۷۹ء میں ایک بزرگ نے مبارک باد دی تھی اور ہمیں وہ مبارک باد اب تک یاد ہے اور ہم خوش ہیں کہ تذلیل کرائے بغیر اور پیسے بغیر اور مُردہ باد کے نعرے کے بغیر سیدھے سادے آبرومندانہ انداز میں ریٹائر ہو گئے ۔

عبدالعزیز خالد سے ہمارا دیرینہ یارانہ ہے پہلے غائبانہ پھر بالمشافہ ۱۹۴۹ء میں ہم فری لانس صحافی تھے دوسرے کاموں کے علاوہ گھر بیٹھ کر ایک ادبی ماہنامہ کتاب ایڈٹ کیا کرتے تھے اس میں عبدالعزیز خالد بھی لکھتے تھے وہ اس وقت کراچی میں انکم ٹیکس افسر تھے ان کی خوبصورت شاعری اور خوبصورت خط کو دیکھ کر بہت متاثر ہوتے اور سوچتے ایسے خوبصورت انسان سے ضرور ملنا چاہیے کراچی گئے تو حسن اتفاق سے ذکریا ساجد کے ہاں قیام ہوا جو آج کل کراچی یونیورسٹی میں شعبہ ابلاغیات کے صدر ہیں دوسرا حسن اتفاق یہ تھا کہ وہ عبدالعزیز کو جانتے تھے چنانچہ ان ہی کی وساطت سے خالد سے پہلی ملاقات ہوئی کچھ عرصہ بعد خالد لاہور آئے تو ان کے اعزاز میں بی این آر آڈی ٹوریم میں ایک علمی نشست ہوئی مرحوم جسٹس ایس اے رحمان صدر تھے بندہ ناچیز بھی مقالہ نگاروں میں شامل تھا وہ محفل اس لئے خصوصی طور پر یاد ہے کہ ہم نے اپنے مقالے کے آغاز میں ایک کہانی سنائی کہتے ہیں کہ ایک شعبدہ گر لوگوں کے

ایک اجتماع میں مختلف کرشمے دکھا رہا تھا اچانک اس نے ایک سیب لیا اور اسے ہاتھ نچوڑ کر گلاس میں ڈال دیا اور للکارا ہے کوئی جو اس میں سے رس کا ایک قطرہ تک اور نکال دے مجھے، ایک نوجوان اٹھا اور اس نے چیلنج قبول کرنے کا عہد کیا اس نے پھوک ہاتھ میں لیا اسے دبایا تو کیا دیکھتے ہیں کہ پہلے جتنا رس اور نکل آیا ہر طرف واہ واہ کے ڈونگرے برسنے لگے اس سے پوچھا گیا کیا کام کرتے ہو بولا میں انکم ٹیکس افسر ہوں ہم نے کہا عبدالعزیز خالد علم و ادب کے معاملے میں اسی قسم کے انکم ٹیکس افسر ہیں اور دیکھئے انہوں نے آنے والے اڑتیس سالوں میں کیا کچھ نہ کر دکھایا۔ عربی فارسی، سنسکرت پنجابی اور شاید اور زبانوں پر بھی عبور پایا۔ کتابیں اتنی لکھیں کہ ان کا سکور ہم عصروں میں نہایت نمایاں ہے ہم نے انہیں بہت مشکل پسند کہا تھا اس کا انہوں نے برا نہ مانا لیکن کچھ علم ہم نے حاصل کیا کچھ انہوں نے مشکل پسندی گھٹائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی ہر تخلیق پسند آنے لگی پھر موضوعات دیکھئے تو اس میں بے حد تنوع نعتیہ کلام میں ایسا نام پیدا کیا کہ رہے نام اللہ کا اور رومانیت کو موضوع بنایا تو اتنی رنگینی کا مظاہرہ کیا کہ کہیں کہیں تھرڈ لے لوگوں کو فحاشی کا گمان گزرا جاپانی شاعری پر بھرپور کتاب کا بھرپور ترجمہ کیا آسکر وائلڈ کی سلومی کو اردو میں پیش کیا مہابھارت کتھا بھی لکھ ڈالی اور یہ کام بڑی سخت ترین زمین میں ہوا اور خوب ہوا دی دلچسپی کے اتنے علمی کام کئے کہ حضرت نعیم صدیقی نے سیارہ کا ایک یا شاید دو بھاری بھرکم عبدالعزیز خالد نمبر چھاپے اور ایک بات بہت اچھی ہوئی کہ ان کے بارے میں جو مواد چھپا وہ سب خاص نمبروں یا کتابوں کی صورت میں ان کے سامنے ہی یکجا ہو گیا اور ابھی یک جائی کا یہ عمل جاری ہے اور ہم نے جان بوجھ کر ایک بات کا ذکر ابھی تک نہیں کیا کہ حضرت عبدالعزیز خالد نے محنت شاقہ سے کام لے کر قرآن حکیم کا منظوم ترجمہ کر ڈالا

اتنی محنت شاید ہی کسی شاعر یا فن کار نے کی ہو اور طرہ یہ کہ سب کچھ اپنے فرائض منصبی کی مکمل اور نہایت باقاعدہ بجا آوری کے باوجود ہوا وہ ان گنے چنے افسروں میں سے تھے جو عین وقت پہ دفتر آجاتے اور کام کی باقاعدگی کا یہ عالم تھا کہ میز صاف رہتی تھی یعنی جونہی کوئی کام آتا تھا اسے نپٹا دیتے تھے اور فالتو وقت میں کچھ پڑھتے لکھتے رہتے تھے یا احباب سے گپ رہتی تھی جس شخص نے اتنا ادبی کام اتنا علمی کام کیا وہ اگر فرائض منصبی کی ادائیگی میں قدرے سست ہوتا تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں تھی لیکن نہیں ایسا نہیں ہوا انہوں نے اپنے بال بچوں کے بارے میں بھی فرائض خوش اسلوبی سے ادا کئے دفتری فرائض بھی کارکردگی کے مظہر تھے اور اس کے باوجود اتنے علمی کارنامے نمایاں سرانجام دیئے کہ ادبی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا وہ دوسرے شعراء سے متاثر ہوئے ہوں گے کیونکہ ماحول سے ہر شخص کسی نہ کسی طرح متاثر ہوتا ہے لیکن ان کی ڈکشن منفرد ہے دوسروں سے الگ تھلگ ہے اگر وہ آج کسی کو پسند نہیں تو کل پسند آجائے گی اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے۔ کہ وہ اردو شاعری میں ایک نئے راستے کے بانی ہیں یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں شاید ہی کوئی ایسا قابل ذکر ادیب یا نقاد یا شاعر ہو جس نے انہیں خراج عقیدت ادا نہ کیا ہو۔

محفلیں

شمیم اکرام الحق

شام خالد

ادبی محفلوں کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ لیکن ان دنوں کوئی بھی محفل سیاسی رنگ سے خالی نہیں اور پھر ادب لاکھ مست ملنگ سہی سیاست کے ساتھ اس کا شروع سے منگیتر والا رشتہ ہے۔ وہی صاف چھپتے بھی سامنے آتے بھی نہیں والا انداز لیکن حلقۂ اربابِ ذوق اسلام آباد کے تعاون کے ساتھ اسلامیہ کالج لاہور کی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن نے جب شاعر عبدالعزیز خالد کے ساتھ شام منائی اور حافظ مظہر الدین اور پیر نصیر الدّین صاحب کے کلام میں بار بار اسلام اور اسلامی نظام کا ذکر آیا تو ایک صاحب نے سرگوشی کی۔

"یہ تو لگتا ہے کہ قومی اتحاد کا جلسہ ہو رہا ہے۔"

اور پھر جب جمیل ملک کی طویل تقریب کے دوران بیشتر حاضرین نماز کے لیے چلے گئے تو ان صاحب کا شک یقین میں بدل گیا اور ایک باریش بزرگ کی ٹھاڑھی کو تو انھوں نے اچھی طرح نظروں سے ٹٹول ٹٹول کر دیکھا کہ کہیں مفتی محمود تو نہیں بیٹھے ہیں۔ تقریب کی صدارت جسٹس عطاء اللہ سجّاد نے کی۔ علیم ناصر خانوس کے مدیر کہنے لگے، اولڈ بوائے تو میں بھی ہوں۔ مگر اسلامیہ کالج کا نہیں بلکہ خالصہ کالج کا۔ سلطان رشک نیرنگِ خیال کے مدیر ہیں انھوں نے عبدالعزیز خالد کو تیز رفتاری کے لحاظ سے اُردو شاعری کا ڈی۔ سی۔ اقرار دیا اور کہا ابھی میں ان کی بائیسویں تصنیف کو نصف بھی نہ پڑھ سکا تھا کہ ان کے نصف درجن مجموعے اور چھپ کر آ گئے۔ ہو سکتا ہے لاہور سے پنڈی آتے آتے ایک مجموعہ اور ترتیب پا گیا۔

پروفیسر کرم حیدری نے منظوم ہدیۂ تحسین پیش کیا اور کہا ؎

خوش ادا بھی ہے خوش کلام بھی ہے
شاعری میں فلک مقام بھی ہے

شبیر حسین ناظم کہنے لگے ؎

یہ جو عبدالعزیز خالد ہے
یہی اُردو ادب کا والد ہے

ممتاز مفتی کو گویا اونگھتے کو ٹہلنے کا بہانہ مل گیا۔ وہ آتے تو سب سنبھل کر بیٹھ گئے انھوں نے بھی مایوس نہیں کیا اور چپٹا مقالہ پڑھنا شروع کیا:

"خالد کا مجموعہ دیکھتا ہوں تو جی چاہتا ہے جزدان میں لپیٹ کر رکھ دوں۔ خالد کو دیکھتا ہوں تو جی چاہتا ہے بھاگ جاؤں۔"

ایک بار ابنِ انشاء سے ایک محفل میں عبدالعزیز خالد کو دیکھ کر میں نے کہا

مفتی! اس آدمی کو دیکھ رہے ہو؟

انشاء۔ وہی جس کی چٹی قمیض پر لنڈے کا ایک کوٹ ہے۔

مفتی۔ ہاں! جس کے چہرے پر اندھیرا اُجالے سے جدا نہیں۔

انشاء۔ ایک وقت آئے گا یہ چہرہ اتنا روشن ہوگا کہ اس کی طرف دیکھ نہ سکو گے۔

مفتی۔ اب بھی دیکھ نہیں سکتا۔

انشاء۔ ایک دن آئے گا جب دنیا اس کی طرف دیکھے گی۔ یہ مرغی انڈوں پر بیٹھی ہے۔ جب اُٹھے گی تو دنیا دیکھے گی۔

مفتی۔ کیا دیکھے گی؟

انشاء۔ سونے کے انڈے۔

آج میں سوچتا ہوں یا اللہ یہ خالد کیا چیز ہے۔ ہر چیز پر حاوی۔

اختر جمال نے اور جمیل یوسف نے شاعر کے فن پر روشنی ڈالی۔ ضمیر جعفری آج کل نیلام گھر کے انعامی ٹکٹ پر عمرہ کرنے گئے ہوئے ہیں جو انھیں بہترین نعت لکھنے پر ملا تھا۔ اسٹیج سیکرٹری نے ان کا غائبانہ شکریہ ادا کیا۔

خدا جانے کس سلسلے میں۔ مگر ایک صاحب بولے:

"وہ وہاں شکر ادا کر رہے ہوں گے کہ طویل محفل میں شرکت سے بچ گئے۔"

جسٹس عطاء اللہ سجاد کہنے لگے:

"مجھ پر صدارت اس طرح نازل ہوئی جس طرح کسی شہر میں سب سے پہلے داخل ہونے والے فقیر پر بادشاہت۔"

اصغر ندیم سید

محفلیں

شام کی اذانیں ہو رہی ہیں۔ سب لوگ لان میں پہنچ چکے ہیں۔ میزوں پر کھانے پینے کی اشیاء آراستہ ہیں۔ مرکزی میز پر اہم شخصیت عبدالعزیز خالد اپنے احباب کے جلو میں موجود ہیں۔ ان کے دائیں جانب غالباً کسی محکمے کے ڈائریکٹر کھڑے ہیں۔ بائیں جانب کسی تعلیمی ادارے کے سربراہ موجود ہیں۔ ان کے پہلو میں محفلیں کا مسکین کالم نویس کھانے پینے کی اشیاء پر خصوصی توجہ کے ساتھ موجود ہے۔ کچھ آگے اور سامنے باذوق معززین شہر گپ شپ کر رہے ہیں۔ جناب عبدالعزیز خالد کو سست دھار کی لکڑی کے دستے والی چھری پیش کی جاتی ہے۔ وہ میز پر موجود بڑے سے کیک پر وار کرتے ہیں جس پر لکھا ہوا ہے:

"آرزوئے اقبال عبدالعزیز خالد زندہ باد"

پھر تالیاں بجتی ہیں اور مبارکباد کا شور سنائی دیتا ہے۔ مسکین کالم نویس "آرزوئے اقبال" والے کیک کو دھڑا دھڑ کھا رہا ہے۔ ممتاز شہریوں کا سکور بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ دعوت ہوتے ہوئے سب لوگ عبدالعزیز خالد کو ان کی نئی کتاب "پروازِ عقاب" کی مبارکباد پیش کر رہے ہیں۔

حضرات!

یہ آنکھوں دیکھا حال ہم نے عبدالعزیز خالد کے ساتھ منائی جانے والی شام سے اخذ کیا ہے۔ خالد صاحب نے حال ہی میں ہوچی منہ کی زنداں نامہ "کا منظوم ترجمہ" "پروازِ عقاب" کی شکل میں پیش کیا ہے۔ بابِ خیر سے بحیرۂ عرب نزد کراچی شہر تک اس ادبی کارنامے کی خبر پہنچی ہے اور کچھ شامیں بھی منائی گئی ہیں۔ خالد صاحب شاعری میں بہت چوکنے اور صحیح وقت پر صحیح چیز پیش کرنے میں خاصے مشہور ہیں۔ یہ کتاب جس موضوع پر لکھی گئی ہے قوم قبول کرنے کے لیے بالکل تیار بیٹھی ہے۔ ہمارا پڑھا لکھا طبقہ ان دنوں ایک ایسے کرب کا شکار ہے جس کا اندازہ اس ادب سے لگایا جا سکتا ہے جو جنگی قیدیوں کے ناقابلِ فراموش تجربات پر مبنی ہے۔ ان دنوں ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے تمام فروعی موضوعات کو تج کر اپنی تمام تر صلاحیتیں اس محاذ کی طرف مبذول کر دی ہیں۔ جو انسانیت کو زندہ رکھنے کی جدوجہد میں مصروف ہے۔ پاکستانی ادب کی تاریخ میں یہ موڑ بہت اہم ہے۔ ہم مطمئن ہیں کہ پاکستانی شاعر اور ادیب اس مسئلے سے غیر جذباتی انداز میں جھلاہٹ اور مایوسی کا شکار ہوئے بغیر برتاؤ کر رہے ہیں۔ اس طرح ایک توانا تحریک جنم لے چکی ہے۔ شاعر اور ادیب اس مسئلہ پر اتفاق رائے رکھتے ہیں

البتہ رویّے جدا جدا ہو سکتے ہیں۔ عبدالعزیز خالد کے تراجم کا موضوع بھی ظلم کے خلاف ایک متوازی احتجاج ہے۔ یہ جیل کی صعوبتوں کی داستان ہے۔ پروازِ عقاب کی بیشتر نظمیں ہماری ہی صورتِ حال کے تناظر میں لکھی گئی ہیں۔ عبدالعزیز خالد کا شعوری جغرافیہ ہمارے بحران سے براہِ راست متاثر ہوا ہے۔ اس لیے اس کی جذباتی وابستگی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ "پروازِ عقاب" کی یہ نظم ہمارے اپنے گھر کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔

ہم میں سے ہر ایک کا راشن
پانی کا آدھا باسن
نہا لو، دھو لو، چائے پکا لو
جو جی چاہے کر لو
ہے منظور اگر منہ دھونا
خیال چائے کا ترک کرو
اور اگر چائے نوشی پہ ہے طبیعت مائل
تو پھر منہ ان دھوتا رہنے دو

عبدالعزیز خالد کی شام میں عاصی کرنالی نے ان کی شخصیت پر مضمون پڑھا۔ عاصی کرنالی کا لہجہ بنیادی طور پر انکسار سے ترتیب پاتا ہے۔ یہ مضمون خالد صاحب کی ملتان میں آمد۔ ملاقات اور رخصتی جیسے واقعات پر مبنی تھا۔ البتہ خالد صاحب کے ادبی نظریات کا حوالہ بھی موجود تھا۔

اس موقع پر ایک مشاعرہ بھی ہوا جس میں شاعروں نے شاعروں کو داد نہیں دی اور سامعین داد دینے کا طریقہ نہیں جانتے تھے۔ اس مشاعرے میں عبدالعزیز خالد۔ آغا خاموش۔ جابر علی سید۔ ایاس عشقی۔ انور مسعود۔ مقبول قریشی اور رشید عثمانی نے حصہ لیا۔ یہ تقریب آغا شیر احمد خاموش اور چودھری عبدالرحمٰن کی معاونت اور محنت سے ترتیب دی گئی تھی۔

ایس قمر الزمان

ینگ تھنکرز ایسوسی ایشن کی — "شامِ خالد"

گزشتہ روز ینگ تھنکرز ایسوسی ایشن، گورنمنٹ کالج آف ٹیکنالوجی لاہور کے زیرِ اہتمام پارک ویو ہوٹل میں "شامِ خالد" منائی گئی۔ جس طلبا، اساتذہ اور شعراء ادبا نے شرکت کی۔ تقریب کا آغاز تلاوتِ قرآنِ پاک سے ہوا۔ اس کے بعد ایک طالب علم امجد الٰہی دانش نے عبدالعزیز خالد کی حمد "بدیع ارض وسما لا الٰہ الا اللہ" ترنم سے پیش کی۔ اس کے بعد "ہونہار بروا" کے عنوان سے ایک طالب علم علی رضا نے عبدالعزیز خالد کی شخصیت اور سوانح پر روشنی ڈالی اور ان کی کامیاب زندگی کو ان کے خلوصِ کار پر مبنی قرار دیا۔ اس کے بعد صدر ینگ تھنکرز ایسوسی ایشن مسٹر قمر الزمان نے عبدالعزیز خالد کی شاعرانہ فتوحات کا نہایت حقیقت پسندانہ جائزہ لیا۔ انھوں نے خالد کی نعتیہ شاعری، منظوم ڈرامے، قومی شاعری اور غزل گوئی کا جائزہ لیتے ہوئے انہیں حضرت اقبالؒ کے بعد ابھرنے والے شعراء میں سب سے زیادہ قدآور قرار دیا۔ قمر الزمان نے ان کی غزل کو جدید غزل گوئی کی آبرو قرار دیا اور کہا ہر چند جدیدیت کے علمبردار خصوصاً ڈاکٹر وزیر آغا جدید گوئی کا پُرشوق نعرہ لگاتے ہیں۔ لیکن جب خود غزل کہتے ہیں تو ان کی بے کلاسیکل غزل گو شعراء سے جا ملتی ہے خالد اور صرف خالد ہی ایک ایسا غزل گو ہے جس نے غزل کو کلاسیکل اسلوب اور شیوۂ غزل گوئی سے الگ کر کے اس میں ارضِ پاکستان کا رنگ و آہنگ اور پنجاب کی لوک ریت اور لوک کہانیوں کی محبوباؤں کا انداز پیدا کر دیا ہے۔

سیکرٹری ینگ تھنکرز ایسوسی ایشن نے اپنی مختصر تقریر میں ینگ تھنکرز ایسوسی ایشن کا تعارف کرایا اور "شامِ خالد" منانے کا جواز پیش کرتے ہوئے کہا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی ہماری قومی ترقی کے لیے ناگزیر ہے اس پر ہماری مادی ترقی کا انحصار ہے اور شعر و افسانہ ہمارے روحانی ارتقاء کے لیے ضروری ہیں لہٰذا مادی اور روحانی تربیت کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی اور تخلیقی ادب کے مابین مفاہمت کی ضرورت ہے یہ ایک شعر کے دو متوازن مصرعے ہیں انہیں دو لخت نہ ہونا چاہیے مسٹر سہراب ظفر نے اُردو میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے موضوعات پر کتابوں کی ناپیدگی کا ذکر کرتے ہوئے ادبا سے استدعا کی کہ وہ اس کو پورا کرنے پر مستعد ہو جائیں۔ نیز شعراء و ادبا سائنس اور ٹیکنالوجی پر منحصر ایسے ادب کی تخلیق کا بھی تجزیہ کریں جو طلباء میں سائنسی شعور اور مزاج پیدا کر سکے اور تفریحِ طبع کا بھی باعث ہو۔

کامل القادری نے عبدالعزیز خالد کی شاعری کے نمایاں پہلوؤں پر روشنی ڈالتے کہا کہ خالد اصلاً سرسید احمد خان، حالی، شبلی اور اقبال کے قبیلے کا سرو بلند ہے اور سرسید احمد خان نے خرد افروزی کی جو شمع جلائی تھی وہ اس روشنی میں ادبی تخلیق کر رہا ہے لہٰذا اس کے ہاں تسخیر کا جذبہ زیادہ سائنسی بنیادوں پر قائم ہے اور سائنس اور مذہب کے مابین کوئی نزاع نہیں وہ حقائق اشیاء جانتے اور تجسس اشیاء کا شاعر ہے یوں بھی جدید طبعیات کے فروغ کے بعد مادیت اور روحانیت کی تفریق ختم ہو چکی ہے۔ اور یہ غلط تصور ختم ہو چکا ہے کہ یہ دو مختلف انواع ہیں۔ اب مادہ کو توانائی اور توانائی کو مادہ میں منتقل کرنے کا تجربہ کیا جا چکا ہے لہٰذا اس حقیقت کا رنگ کلامِ خالد میں بھی جھلکتا ہے۔

شام خالد کے صدر جناب عارف عبدالمتین نے خالد کی فنی اور علمی یافت کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیتے ہوئے اپنی عالمانہ تقریر میں کہا کہ سائنس اور ادب دونوں ادراک حقائق کے ذرائع ہیں اور ان کے مابین فرق و امتیاز طریقہ کا ہے۔ نہ کہ بنیادی مقاصد کا۔ انھوں نے فرمایا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی اور ادب میں مفاہمت کی آرزو فطری ہے اور اسے زیادہ مستحکم بنیادوں پر ہونا چاہیئے۔ سائنس اور دین یا روحانیت اور مادیت دونوں شعبے حقیقت کی تفہیم کے لیے سرگرداں ہیں۔ خدا تعالیٰ نے بھی تسخیر کائنات پر بار بار ابھارا ہے۔ مذہب اور سائنس کے مابین بیر کے مناظر یورپ میں ملتے ہیں۔ مسلمانوں کی تاریخ پر نظر ڈالیے وہاں کسی گلیلیو کو دار و گیر سے گزرنا نہیں پڑا ہے۔ انھوں نے مسلم سائنس دانوں کے سائنسی کارنامے اور ایجادات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ انسان کا عمل تب ہی عملی پیکر میں ڈھلتا ہے۔ جب دماغ اور جسم دونوں کا عمل عقل و شعور پر مبنی ہو۔ خالد صاحب کو ایک سے زیادہ زبانوں پر عبور حاصل ہے! اور تمام علوم کو سمیٹ کر اور باہم مربوط کر کے اسے شاعرانہ پیکر میں ڈھالا ہے انھوں نے ماضی و حال کو باہم وگر کر دیا ہے۔ اور مستقبل کے رخ سے نقاب اٹھا دیا ہے۔ اس طرح ان کی شاعری میں د) کی خصوصیت پیدا ہو گئی ہے۔ اور یہی عبدالعزیز خالد کی سب سے عظیم و جلیل شاعرانہ یافت ہے۔

"شام خالد" میں پروفیسر طفیل دار، پروفیسر تحسین فراقی، جناب علیم ناصری جناب منظور احمد سعید، جناب انعام الحق جاوید نے عبدالعزیز خالد کے فکر و فن اور شخصیت پر مبسوط مقالات پیش کیے اور پروفیسر حفیظ صدیقی اور پروفیسر تحسین فراقی نے خالد صاحب کے کمالات کی داد اپنے منظوم پاروں میں دی۔

ینگ تھنکرز ایسوسی ایشن کی یہ تقریب ساڑھے چار گھنٹے جاری رہی اور "کلام خالد بہ زبان خالد" پر ختم ہوئی۔ خالد صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں اپنا کلام سنایا جو طلبا میں بہت پسند کیا گیا۔

اسلم ملک

جناب عبدالعزیز خالد ہمارے یہاں کے ایک قدر آور شاعر ہیں۔ جنھوں نے فصیلِ شہرِ سخن پر تخلیق کے ان گنت چراغ روشن کیے ہیں۔ چودھویں صدی ہجری کی آخری دو دہائیوں میں ادب اور ثقافت کے حوالے سے نعتِ رسولِ مقبول کی ترویج و ترقی کے لیے تحقیقی اور علمی سطح پر جو کام ہوا ہے اس میں سب سے زیادہ حصّہ عبدالعزیز خالد ہی کا ہے۔ "منمنّا" "فارقلیط" "ماذا" "طاب طاب" گنجینۂ نعت میں گرانقدر اضافے ہیں۔ حسّان بن ثابتؓ۔ علّامہ بوصیریؒ، جامیؒ، سعدیؒ، امیر مینائی، ورد، محسن کاکوروی، مولانا احمد رضا خاںؒ، حالی، اقبال لاہوری اور مولانا ظفر علی خان سے ہوتی ہوئی نعت کی روایت جب عبدالعزیز خالد، حافظ مظہر الدینؒ اور حفیظ تائب تک پہنچتی ہے تو اس میں جذبات و عقیدت کے ساتھ ساتھ سیرت نگاری کا عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے۔ عبدالعزیز خالد غزل کے بھی بہت اچھے شاعر ہیں۔ لطیف۔ انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی انھی کا حصّہ ہے۔ غزل اور نعت کو عالمانہ شان دینے والے اقبال کے بعد تن تنہا عبدالعزیز خالد ہی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ پاکستانی ادب عہدِ خالد میں سانس لے رہا ہے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ عبدالعزیز خالد دل کش اور دل آویز شخصیت کے مالک ہیں۔ نرم دم گفتگو کی ترکیب انھی پر سجتی ہے۔ خوش گفتار، عجز و انکسار کے پیکر، پچھلے دنوں عبدالعزیز خالد سیالکوٹ تشریف لائے تو شہرِ اقبال کے علمی اور ادبی حلقوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔

سعید صفدر

عبدالعزیز خالد — ایک پیارا شاعر

عبدالعزیز خالد شاعر ہیں۔ یہ کون نہیں جانتا۔ لیکن یہ بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ درحقیقت وہ بہت ہی پیارے شاعر ہیں۔ پیارے شاعر کی اصطلاح ان شاعروں کے لیے استعمال کی جانی چاہیئے جو اپنے شعروں میں بھی اور اپنی باتوں میں بھی اور اپنی خوب صورت مسکراہٹ میں بھی پیارے لگیں اور یہ محسوس ہو کہ موصوف اگر شاعر نہ ہوتے تو پھر بھی ان کی محبوبیت میں کمی نہ ہوتی۔

یہ بات میں نے اس لیے کہہ دی کہ کل عبدالعزیز خالد پر بہت سے مشہور لوگوں نے گزوں لمبے مضامین اور میلوں لمبی تقریریں کیں۔ لیکن مجال ہے جو یہ بتایا ہو کہ اپنے چہرے کو ٹھوڑی پر رکھے، میز کے ساتھ پڑی تیسری کرسی پر سادہ شلوار قمیض میں ملبوس جو شخص نہایت لاتعلقی سے یوں بیٹھا ہے جیسے اس عبدالعزیز خالد سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ جس کے تذکرے سے ان کی زبانیں خشک ہوئی جاتی ہیں۔ اتنا دل گداز، حساس، گھرا اور ٹھوس ہے اور اس میں مسحور کر دینے والی کوئی ایسی غیر مرئی کشش ہے کہ اگر یہ ملٹن کے پائے کا شاعر بھی ہوتا تو یونہی سے بریٹی ہونا بے نیازی سے مسکراتا اور یونہی ایڈمائر کیا جاتا۔

ان میں محترمہ شناور ڈوگر نے کچھ ایسی کوشش کی۔ لیکن وہ بڑی محتاط تھیں۔ کیونکہ یہ کسی کو نہیں پتہ کہ اپنے کلام میں نسوانی حسن کی تعریف کے سلسلے میں عبدالعزیز خالد کچھ ایسے جذباتی ہوتے ہیں کہ شعر کم اور پیکر زیادہ تراشے ہیں اور وہ بھی اتنے حسین کہ باقی سب چیزیں حافظے سے محو ہو جائیں۔ نہ کوئی خیال رہے اور نہ فلسفہ، بس ایک تصویر ہو جو ذہن کی دیواروں سے چپکی رہ جائے۔ چنانچہ محترمہ نے ملٹن کا سہارا لیا اور یہ کہنا پڑے گا کہ انہوں نے اپنی بات کو اس خوب صورتی سے نباہا اور ایسے دل کش پیرائے میں اتنی شیریں گفتگو کی میرا اندازہ ہے کہ انجمن طلبا قدیم اسلامیہ کالج کے منتظمین اگلی شام اب ان کے ساتھ ہی منائیں گے۔ شناور ڈوگر کا دم غنیمت تھا کہ جو لوگ عبدالعزیز خالد کو جاننے نیشنل سینٹر آئے تھے انہیں ان کی شخصیت کو گھما پھرا کر دیکھنے کا موقع ملا ورنہ اس کے بعد تو جسٹس ایس اے رحمان کو چھوڑ کر جو بھی آیا۔ اس نے خالد کو سمجھنے میں اپنے عجز کا اظہار کر کے راہِ فرار اختیار کی۔

ان کے ایک سابق اُستاد اور اسلامیہ کالج کے پرنسپل خواجہ محمد اسلم نے تو اُستادانہ منصب کا فائدا اُٹھا کر ان کی ماسٹروں کے مخصوص انداز میں گوشمالی بھی کر دی اور بالفاظ دیگر یہ کہا کہ:

"صاحبزادے! اتنا مشکل تو نہ لکھا کرو کہ کچھ پلے ہی نہ پڑے۔"

اس دوران میں خالد نگاہیں نیچے کیے دبے دبے مسکراتے رہے اور اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ نوجوانی میں بقول خواجہ محمد اسلم کے موصوف خاصے شرمیلے واقع ہوئے ہوں گے۔

اکبر کاظمی کا منظوم خراج تحسین کثیر المقاصد تھا وہ اس طرح کہ اپنے ساتھ اُنھوں نے عبدالعزیز خالد کے فن کو خراج تحسین پیش کیا اور دوسرے ناقدری عالم اور ناشروں کی بے التفاتی کی بھی خبر لے ڈالی۔ اُنھوں نے کہا کہ خوش کلام ہونے کے ساتھ خالد خوش نصیب بھی ہیں کہ انھیں اپنے زمانے میں ہی شہرت ملی۔ تصنیفات شائع ہوئیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ان معدودے چند شاعروں میں سے ہیں جن کو ناشر پہچانتے ہیں۔ حالانکہ اس دور میں ایسے بھی ہیں (اشارہ اپنی طرف تھا) جو خونِ جگر سے فن کی آبیاری کرتے ہیں اور کوئی پوچھتا بھی نہیں۔

سلطان دہلوی

ایک سپاسنامہ

قابلِ صد احترام!

ادارہ شباب پبلیکیشنز کی جانب سے آپ کی تشریف آوری کا دلی خیر مقدم کرتا ہوں اور آپ کا دلی ممنون ہوں کہ آپ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود آج شمع ادبی معموں کی تقسیم انعامات کی تقریب میں تشریف لائے۔ شمع معمے ایک طویل عرصہ سے اُردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ شمع ادبی معموں کے اجراء کا مقصد اُردو ادب کی بقاء و ترویج ہے۔ شمع ادبی معمے بہترین مشغلہ ہی نہیں اُردو ادب کی ترویج و ترقّی کا بھی ایک ذریعہ ہیں۔ شمع ادبی معموں کے اشارے بلند پایہ ادیبوں کی کتابوں سے لیے جاتے ہیں۔ یہ اشارے اتنے جامع اور مکمّل ہوتے ہیں کہ صحیح جواب کا انتخاب کرتے ہوئے ذہنی صلاحیتوں اور علم و ادب میں اضافہ کے مواقع ملتے ہیں۔ اس طرح پروانوں میں علمی، ادبی شوق پیدا کرنے میں شمع ادبی معمے پیش پیش ہیں۔

مہمانِ عالی قدر!

شمع ادبی معموں کے تقسیم انعامات کی تقریب میں آپ کو شرکت کی تکلیف اس لیے دی گئی ہے کہ آپ کی شخصیت علم و ادب کے میدان میں روشنی کے مینار کی حیثیت رکھتی ہے۔ دنیائے شاعری کا آپ کو مصوّر کہا جاتا ہے۔ اہلِ نظر آپ کی شاعری کو ایک وسیع و عریض گلستان سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ جس میں کوہستانی ندیوں کے بلند آہنگ نغمے بھی ہیں اور آہستہ خرام نہروں کے دھیمے سُر بھی، آپ کی شاعری میں بلبل کے محبّت بھرے گیت بھی ہیں۔ اور قمری کے دلدوز نالے بھی، آپ کی شاعری میں طاؤسِ شعر کا رقصِ مستانہ بھی ہے۔ اور پروازِ معانی کا رقصِ بسمل بھی آپ کے پاس الفاظ و معانی کا ایک لشکرِ جرّار ہے جو آپ کے ایک اشارے پر حرکت میں آجاتا ہے اور الفاظ و معانی کے لشکری ہر لحظہ نئی آن نئی شان سے گامزن رہتے ہیں۔

مہمانِ گرامی قدر!

آپ صاحبِ جمال بھی ہیں، صاحبِ جلال بھی، آپ کی شخصیت میں جلال سے زیادہ جمال پایا جاتا ہے۔ آپ کی شاعری میں جلال کا عنصر نمایاں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ فطرت کے جلال سے بے پناہ متاثّر نظر آتے ہیں۔

آپ کے ذوق عربیت کی وجہ سے آپ کی شاعری میں جلال نمایاں ہے۔ عربی زبان نے صحرا کے آغوشِ جلالت مآب میں نشوونما پائی ہے۔ اس لیے اس میں جلال زیادہ ہے چونکہ آپ کی شاعری میں ذوقِ عربیت کی وجہ سے کثرت سے عربی الفاظ و تلمیحات ملتے ہیں اس لیے آپ کے کلام میں عربی زبان کا جاہ و جلال پایا جاتا ہے۔

آپ نے اُردو کا کو عربی کا حسن معانی، رنگ بلاغت اور شکوہ صحرائی دیا ہے اور اُردو کے دامن کو صحرا کی طرح وسیع کر دیا ہے۔ آپ کے کلام میں لغت و معانی کی کثرت نہیں بلکہ تخیل و تصور اور استعارہ و کنایہ کی فراوانی ہے۔ آپ کی شاعری میں عربی، فارسی، ہندی نیز یورپی زبانوں کے الفاظ، محاورے، استعارے، تشبیہات و تلمیحات اور ان کے شعراء و حکماء کے افکار و تصورات اور جذبات کا رنگ بھی پایا جاتا ہے۔

معمارِ ادب!

آپ کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ڈرامائی عنصر بھی ہوتا ہے جو شعریت و غنایت میں جذب ہو کر اُسے چیزے منفرد اور دل کش بنا دیتا ہے۔ آپ کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ آپ نے شعر و ادب کی اسلامی روایات کا احیاء کرنے کی کوشش کی ہے جن کا موجودہ دور منکر اور ان روایات سے نابلد ہے۔

آپ کی شاعری میں حبیب خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے عشق کا عنصر نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی نعتیہ شاعری نہ صرف عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بلکہ آپ کی زبان عربی کی محبت اور ذوقِ عربیت کی بھی آئینہ دار ہے۔ آپ نے اُردو زبان اور زبانِ شعر کی ثروت میں گراں بہا اضافہ کیا ہے اور یہ بہت بڑا کارنامہ ہے جس پر اُردو ادب کے پرستار جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ آپ کی شعری تخلیقات کی تعداد تین درجن کے قریب ہے اور آمد کا دریا اُسی طرح موجزن ہے۔ آپ پر فضلِ رحمٰن ہے اس لیے کہ آپ کا دل محبوبِ رحمانی کی محبت و عقیدت سے معمور و منور ہے۔ اور آپ کا قلم ان کے اوصافِ حمیدہ کے اظہار و بیاں کے لیے وقف ہے۔

قابلِ احترام مہمانِ خصوصی!

یہی وجہ ہے کہ ہم نے شمع ادبی معموں کی تقریب تقسیم انعامات کی صدارت کے لیے آپ جیسی علمی و ادبی شخصیت کا انتخاب کیا ہے تاکہ شمع ادبی معموں کے پرستاروں کو علم و ادب کے معمار سے متعارف کرانے کے ساتھ ساتھ آپ کو ادب کے متوالوں سے بھی متعارف ہونے کا موقعہ فراہم کیا جائے۔ تاکہ شمع ادبی معموں کی تقسیمِ انعامات کی یہ تقریب صحیح معنوں میں ایک ادبی تقریب بن سکے۔ آخر میں میں پھر ایک مرتبہ آپ کی تشریف آوری کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں، ادارۂ شباب آپ کی اس عزت افزائی پر مدتوں نازاں رہے گا۔

جواب سپاسنامہ

پاکستان کے مایہ ناز ادیب و شاعر جناب عبدالعزیز خالد نے سپاسنامہ کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

"ادارۂ شباب اور اس کے منتظمین قابل صد مبارک باد ہیں۔ جنھوں نے شمعِ ادبی معموں کا اجراء کر کے اگرچہ نسبتاً تاخیر سے "اُردو ادب کے شائقین کے لیے ایک دلچسپ اور مفید علمی و ادبی مشغلہ فراہم کیا ہے۔ ان معموں کے اشارے مستند ادیبوں کی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ معمے اپنی دیانت داری و راستی کی بنا پر مقبول خاص و عام ہوں گے۔

عوام الناس کو جو معموں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ کتابوں کی دنیا کے قریب تر لائیں گے۔ اور یوں بالواسطہ طور پر ادب کے فروغ کا باعث ہوں گے۔

میری دُعائیں ادارۂ شباب اور اس کے باہمت اور جواں سال مُنتظموں کے ساتھ ہیں۔"

عبدالعزیز خالد

علی سفیان آفاقی

"مہابھارت" کے تذکرے سے عام طور پر ذہن میں جنگوں اور لڑائیوں کا تصور ابھرتا ہے۔ حالانکہ یہ کتاب
محض جنگ و جدل کے واقعات ہی تک محدود نہیں ہے اگر عام طور پر ہم اسے مسلسل جنگ کا ایک بیان ہی سمجھتے ہیں کسی
صاحب کی جدوجہد کا ذکر مقصود ہو تو کہا جاتا ہے کہ وہ تو "مہابھارت" کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو
عبدالعزیز خالد صاحب بذات خود مہابھارت کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ان کی جنگ کے کئی محاذ ہیں۔ ایک طرف ان کی جنگ
جہالت اور کم علمی سے ہے تو دوسری طرف انہوں نے فکر و دانش کا محاذ کھولا ہوا ہے۔ تیسرا محاذ شاعری کا ہے۔
چوتھے محاذ پہ وہ مذہبی کتابیں کھول کر بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں اور آسان و منظوم قرآن عام فہم انداز میں لوگوں تک پہنچاتے
ہوئے دیکھے جاتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک ان کی سب سے بڑی جنگ اردو ادب کے نقّادوں اور گروہ بندیوں کے
ساتھ جاری ہے۔ ایک ایسا شخص جو خاموشی سے ہر صلے اور ستائش سے بے نیاز، ادبی اور علمی کاموں میں مصروف ہے
ہمارے پیشہ ور نقادوں نے اس کا آج تک کما حقہٗ نوٹس نہیں لیا۔ اس کے بارے میں نہ خود جاننے کی کوشش کی
اور نہ ہی دوسروں کو بتانے کی زحمت گوارا فرمائی۔ عبدالعزیز خالد کی علمیت نے انھیں مرعوب کیا، نہ ان کی شاعرانہ
ہنرمندی نے انہیں مسحور کیا۔ انہوں نے ایک ایسے شاعر کی طرف قرار واقعی توجہ دینی گوارا نہیں فرمائی جو حقیقت میں اردو
کے چند گنے چنے عالم فاضل شاعروں اور مصنّفین میں سے ایک ہے اور جو اپنے علمی افتخار اور معیار کے اعتبار سے ان
لوگوں کی صف میں شامل ہے جنھیں شمار کرنے کے لیے ایک ہاتھ کی انگلیاں بھی بہت زیادہ ہیں۔ جسے اردو، عربی
فارسی اور ہندی پر یکساں عبور حاصل ہے۔ جس نے شاعری کو افادیت اور مذہبی مطالعے کے لئے وقف کرنے کی سعی کی
ہے اور اس میں کامیاب بھی رہا ہے۔ اپنے تنوّع کے اعتبار سے عبدالعزیز خالد ان لوگوں میں شامل ہیں جو کسی بھی زبان
کے ادب کے لیے سرمایہ ہوتے ہیں۔ مگر اس محاذ پہ بھی مہابھارت کی جنگ جاری ہے۔ وہ بڑے آرام اور اطمینان
سے اپنے ہودے پر فروکش ہیں اور ان کے چاروں طرف میدانِ دار و گیر برپا ہے۔ گھمسان کی جنگ جاری ہے۔
کس نمی پرسد کہ کون کیا ہے؟

مگر اردو زبان کی خوش قسمتی رہی ہے کہ ہر دور میں اسے بے غرض اور بے لوث لکھنے والے حاصل ہوتے رہے
ہیں، جب خوشامد کا زور اور تحسین باہمی کا شور کم ہوگا اور گرد بیٹھے گی تو عبدالعزیز خالد کا اصل ادبی و علمی قد و قامت

نمایاں ہوگا۔ اردو میں ایسی مثالیں بے شمار ہیں۔

ایک بات جسے ناقدار اردو کی کمزوری بھی قرار دیتے ہیں دراصل اس کی قوت اور صلاحیت بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ زبان دوسری زبانوں سے الفاظ و خیالات مستعار لیتی ہے۔ لیکن دیکھا جائے تو ایک جاندار متحرک اور بھرپور زبان کے لئے یہ ایک بہت بڑی قوت ہے۔ جس طرح بہت سے دریا سمندر میں آکر گرتے ہیں اسی طرح اردو ادب بے شمار زبانوں کا نچوڑ ہے اور یہ اس کا ایک افتخار بھی ہے۔ انگریزی زبان کی ایک خوبی یہ بیان کی جاتی ہے کہ دنیا کی ہر زبان کا علم و ادب انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اردو کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ انگریزی میں اس قسم کے کام کرنے کے لیے بہت بڑے ادارے اور منظم تحریکیں موجود ہیں جبکہ اردو میں یہ کام انفرادی طور پر عبدالعزیز خالد جیسے بے لوث اور سرپھرے لوگوں نے کیے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ کیا یہ بھی ممکن ہے کہ عبدالعزیز خالد صاحب کو ان کی زندگی ہی میں وہ عظمت اور مقام حاصل ہو جائے جس کے وہ مستحق ہیں؟ حالانکہ وہ ان باتوں سے بالاتر اور بے نیاز ہیں۔ جس طرح وہ اپنے محکمانہ فیصلے کرتے وقت ہر ترغیب اور ہر لالچ و مصلحت سے بے نیاز ہوتے ہیں، کسی سفارش تعارف یا رشوت کے بغیر وہ محض کیس کی نوعیت دیکھ کر اس کا فیصلہ کرتے ہیں اور اکثر یہ فیصلے چونکا دینے والے ہوتے ہیں۔ میں نے بے شمار لوگوں کو جو اُن سے قطعی انجان تھے فیصلوں کی صداقت پر انھیں دعائیں دیتے ہوئے سنا ہے، حالانکہ بعض اوقات وہ ایسے فیصلے بھی کر دیتے جو قطعی اختلافی اور متنازعہ ہو سکتے ہیں۔ اس پر ان کے ایک ماتحت کا تبصرہ دلچسپ اور قابل غور ہے۔ وہ اپنے ایک ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ خالد صاحب بعض اوقات ایسے فیصلے کر دیتے ہیں کہ سارا محکمہ حیران رہ جاتا ہے۔ مگر آج تک کسی نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سوچا کہ انھوں نے یہ فیصلہ کسی دباؤ یا لالچ کے تحت کیا ہوگا۔

یقین کیجئے۔ یہ شخص ادب کے معاملے میں بھی اتنا ہی پُرخلوص، بے لوث اور دیانت دار ہے جتنا اپنے پیشے کے معاملے میں۔ یا اس بات کو الٹا کر بھی کہہ سکتے ہیں۔ وہ ایک ایسے شخص ہیں جن کی بے نیازی اور دیانت و صداقت کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ میرا دل نہیں مانتا کہ زمانہ ایک ایسے شخص کے ساتھ بے انصافی کرے گا۔

انگریزی مضامین

PORTRAIT OF A POET

BY

IRSHAD AHMAD HAQQANI

It was a hot summer morning in 1944. I had been admitted to the Islamia College, Lahore, a few days back and had gone to the library to collect my card. Near the librarian's desk stood a slim, simply dressed student. The Asstt. Librarian was speaking to him: "So you are Aziz Saheb who has secured third position in the whole of the Punjab and first among the Muslims". "Yes", said the young man in a well modulated voice.

I had wanted to meet Abdul Aziz ever since he had topped the list of successful candidates in the Middle School Examination in 1942. When the results of the 1944 Matriculation Examinations were published, I was naturally interested to know how Aziz had fared. My curiosity was satisfied as soon as I saw the results. Abdul Aziz had repeated his earlier performance. He had stood first amongh the Muslims and third in the Punjab. Naturally, his presence at the Islamia College came as a pleasant surprise to me.

A few days after this chance encounter, I was formally introduced to him by a common friend and we soon got on intimate terms. Aziz Saheb stayed at the Hailey Hostel which has since been renamed Iqbal Hostel. I was at Rivaz Hostel but I spent most of my spare time in Aziz's room. Aziz Khalid's room was filled with books arranged neatly on a table. In one corner of the room was a prayer rug.

Although Khalid quickly became known to most of the boys at the College, the circle of his close friends remained restricted. He spent most of his time in his room and rarely ventured out except for classes. Inspite of being the most prominent student of the college, he never bothered with student activities.

He was shy in company but talked quite freely in the circle of close friends. At this time, he read voraciouly. He would take out piles of books at a time from the library and pour over them. He made copious notes of everything he read. At times, he wrote as many as 100 pages of notes at a stretch. He took down not only the words and sentences that he liked but also a variety of other useful information. He spent a great deal of time and energy taking notes and sometimes I wondered if all the labour involved in the process was really doing him any good. I know better now.

What I sometimes looked upon as useless drudgery on Khalid's part was in fact an important phase in the development of his intellectual powers.

Khalid's pet subjects were English and Persian literature. He had offered Mathematics and Economics too in Intermediate but I never once saw him read any extra-curricular work on these subjects. He eventually took his master's degree in Economics but he was never attracted by these subjects. That is why despite his excellence in English and Persian, he could not maintain the same standard of performance at college as he had at school. As a matter of fact, the subjects offered by him were not of his own choice. They had been selected at the behest of others whose main consideration was a useful career for him. Khalid's own bent of mind lay in another direction and even he himself was not fully aware of it at that time.

Khalid's poetry is older than my friendship with him. He was already writing good verse by the time he came to the college but he still had to master the technicalities of poetry.

Khalid's relations with his teachers were always cordial. With some of them even fraternal. Many of them visited Khalid in his room, The more notable of these was Rafiq Khawar who initiated Khalid in the complexities of poetry. To the best of my knowledge, he has not been anyone's disciple in poetry. In 1945, he won a Gold Medal for reciting the best poem of the year at the annual meeting of the Anjuman-e-Himayat-e-Islam. The college magazine, Crescent, frequently carried Khalid's poems during his tenure of its Editorship. During this time, he rendered many of Iqbal's poems into English.

In the beginning, Khalid used Sehbai as his poetic name but he was not satisfied with it. He wanted to change it and for quite sometime he considered alternative names. Finally, he settled for Khalid and this has been his since.

Khalid's career opened rather un-satisfactorily. He appeared for the Civil Service competitive examination when he was in the M.A. Twice, he passed the written test with flying colours. But the first time, he could not qualify at the viva-voce. The next year he passed in both but for reasons that his is not the place to go into, he was not posted to the Civil Service but appointed an Income Tax Officer.

Khalid was very disappointed, so far, he was not fully conscious of his own bent of mind and his great poetic talent. He, therefore, experienced a sense of deprivation.

But soon another anguish was gnawing at his soul. He was intellectually distrubed. It was due largely to the fac that his personality and talents were struggling to find expression in some medium best suited to his genius. He wanted to do something in life but what? That was the pose and it kept Khalid's mind in a state of turmoil for quite sometime. He wrote a letter to me at this time and this letter is amply reflective of his state of mind.

After a bitter struggle, his genius found its field --poetry. Now, he had a sense of release from the oppressive gloom that threatened to stifle his soul. He began writing poetry with renewed zeal. His first book "Zara-dagh-e-Dil" came out in 1955. The publication of this book brought for him more encouragement and despair at the same time. There was encouragement in the fact that he had found his calling in life. There was despair because of the way the book had been received by literary circles in the country. Most of the reviews were hostile, and betrayed an astonishingly naive approach. The sarcasm was simply venomous. It would have annihilated a lesser talent, but for Khalid, it posed a challenge.

In one way, this literary hostility did him good. He came out of his shell of idealism and, for the first time, became aware of the fact that realm of arts and letters is as much riven by personal and factional rivalries as any other; that there are in it as many inequities as elsewhere. He was bitter and could not concentrate on creative work for, sometime. But "Genius does what it must". The mood passed and Khalid began writing again. As a results, during the past eight years Khalid has enriched Urdu poetry by some one dozen collections.

Khalid has by no means arrived yet. The way he has been writing consistently good poetry all these years is merely a pointer to his future greatness. At the pace, he is coming he appears destined to achieve an immortal place among Urdu writers. You might perhaps want to dismiss these predictions as merely the effusions of a friend. But there are factors that point incontrovertibly towards such a happy consummation For instance, Khalid's poetic talent is indubitably of the highest order. His reading is extensive and far ranging and his erudition great. His mastery of a number of foreign languages and literature and their mythology is extensive as can be evidenced from his copious references to these in his poetry. Be it Greek, Arabic or Persian, Hindi, English or Urdu, he displays a knowledge of their classic and modern literatures that is unrivalled.

There is one other important factor. For Khalid Poetry is not just one among many interests. It is the be-all and end-all of his life. All his intellectual resources are devoted to it. He is a government servant but he has almost no social life. He comes home directly from office and devotes the rest of his time to his literary and intellectual pursuits. The best part of his budget is laid out on books. He has no use for any other pursuit except the one that he has made the goal of his life.

Having followed Khalid's career so closely for such a long time, I am convinced that the Almighty has earmarked him for something spectacular. And his life so far has merely been a preparation for this big task. What this achievement is and when it will take place, is hard to foresee.

His art and his message are still in a process of evolution. As soon as the contours of this message have taken on a more distinct shape his poetry is bound to blaze many more new trails and in many new directions, illumining wholly new areas of human thought and endeavour. His genius is bound to carve out an immortal nichs for him not only in the history of our literature but also in the renaissance of Islam.

Emerson says " When nature has work to be done, she creates a genius to do it" And she has done.

THE CREATION OF FARQALEET

MAULANA ASADUL QADRI

THE rise and decline of a nation is very much based on the rise and decline of its language. And Pakistan, to forward march, cannot but concentrate on building up fountain springs of inspiration and thinking. Urdu, for the first time a national language, has to meet the challenges of the future.

Abdul Aziz Khalid has with uncommon insight realized the urgency and imperativenes of this demand and has set himself to poineer the expedition. He has created the Farqaleet, the book which has won him the highest national recognition--Adamji Literary Award. Farqlaeet is not just a poetic work; it is an invention, an invention in style, in meter and rhyme, in diction and vocabulary, in inspiration and expression. It is a revolutionary departure from the orthodox pattern. It is a blending of many hues to bring out a new fascination. And the hues have come from many an orchard all over the world, many a philosophy and culture in many a time and place. With his firm grip on Oriental and Occidental languages, with his intensive and extensive studies, with his creative genius to forge out a new pattern, the poet is well equipped for his task. With all confidence in himself, he never defers to the popular cry. His job is to cheer, to raise, to guide. A poet exercises the highest functions of human nature. He is the world's eye. He is the world's heart. He sees and feels for the humanity at large.

He is the compliment of his hearers. They drink his words because he fulfils for them their own nature. He is the master not only of those whose language he speaks but also of those into whose language his own can be translated. The people delight in it; the better part of the listener echoes "This is music: This is myself"

Khalid is great not because he can alter matter but because he can alter the state of mind. A great poet is the king of the world because he can give the colour of his thought to all art.

Abdul Aziz Khalid is not a free-thinker. He rises above many a current wave of secularism, socialism, modernism and revolutionaryism. The inspiring force of his poetry is Islam--- words and deeds, principles and examples. An analogy may be found with Dr. Iqbal who projected Khudi as his centripetal message and mission. Khalid also believes in producing poetical acid of the same formulae though not to preserve any strict equivalence of words. Iqbal was versed in both the orient and the occident. Khalid is too.

Khalid is the modern Nazir Akbarabadi, His Farqaleet and other books have refused to follow traditional confines of poetical expression, of an overdoes of the Persian and the Arabic. Khalid borrows copiously from the Sanskrit and the Hindi in an attempt to lay down such forms and patterns as may take in more intensive and extensive thought content, as may better fulfil the demands of the future. Khalid creates tomorrow's Urdu and Urdu's to morrow.

That way, our poet blends the east with the West, the modern with the ancient, the practical with the classic. And the art is to make the blending into something happier and

grander. Farqaleet is able to incorporate not only words but also whole combination of words from other languages and thereby elevate the international representative character of Urdu, its tone and temper, its in-take and off-take, its message and mechanics.

The book is divided into two broad sections. The first Two of these sub-sections are devoted to Naat, praises to the Holy Prophet of Islam. The approach is strikingly different from those of conservative patterns. The Hindi poetic of addressing love from a woman has been adopted at places. The other broad section is of extracts, both in original and in translation from the Ahadith (Prophet's traditions), History of Islam, Old Testament, Bhagwat Gita sayings from Gautama Budha, Granth Sahib of Guru Nanak, from the writings of Nizamul Mulk Tusi, of Radhakrishnan, of Emerson, of various poets, both classic and contemporary. A perusal of these extracts is a voyage into many lands, many different cultures and atmoshperes.

Khalid is not merely a poet, he is a translator too par excellence. In fact, after obtaining the highest academic degrees, he took to translation. So far he has translated all the Persian works of Dr. Iqbal, (to which Sir Abdul Qadir wrote the preface), several works of Shakespears, Plato's Rhetoric, Metamporphoses, etc. His "Salome" is an excellent effort at reproduction in a new garb. With his devotion to history, economics, philosophy literature, English Persian and Arabic, he has developed a keen insight, a deep diving, a robust evaluation.

Farqaleet is a creation of this Brahimi Nazar. It is an outcome of that great treasure of knowledge, that

great collection of select books called his library. The vast and varied reading has given him a pen of steel with a point of diamond.

The creator of Farallet is an interesting and interested personality. Hundreds and thousands of couplets ever dance on his smiling lips. And whenever he puts forth a verse, it seems as if it was made for that particular occasion. His love is poetry. His poetry is love. He is a Milton working at accounts. In the words of Shakespeare he is "young in limbs, in judgement old".

COLLECTION SPLENDED

FARQALEET

ABIDA RIZVI

Majestic in form and graceful in motion, this newest collection of Mr. Khalid's poems in another amazing tou deforce in literature. He writes with high seriousness and demands the same of his readers, for scattered over his pages are intellectual jewels and flowers of sentiment that may not be recognised and appreciated without a background of reading as wide and varied as the author's. Mr. Khalid is unique among the poets of the time. Though he does not affect a moral aim, the exalted content of his poetry must be identified as the instrument of moral good. With imagination which is both intense and comprehensive, he ranges over the entire period from classical Greece to the present, absorbing radiations from many great minds and with catholic genius transmuting the material from various sources into the substance of intriguing and edifying poetry.

The book is divided into seven sections, each being a 'Naat' ode to the Holy Prophet of Islam whose advent had been heraled in the holy books of the Christians and the jews and whose divine mission it was to be saviour of mankind. Citing couplets from Saadi's memorable "Balaghul Ula Be Kamalehi...", the poet opens with an invocation to the Prince of Prophets and closes the

Thirteen Hundred and Eighty-Fourth couplet also the year of the Hejira; with a fervent iteration of his own devout hope to be counted among the slaves of him whom God described as the manifestation of His Mercy to all creation.

Again and again there is a splendid succession of richly musical couplet of grand imagery, and though he is nearly always dealing with reflection rather than immediate experience, it is a tribute to his genius that the pulse of his petry does not flag.. Spread all over are allusions to the Holy Quran, the Hadith and to men and events in the history of Islam. Mr. Khalid seems to have finally rejected the conventional concept of the poet as one striving to cheer his own solitude with sweet sounds: he looks upon his role as vastly more purposive. To whom else should he turn, in the consciousness of this high office, but to that eternal fount of inspiration, the Holy Prophet, who embodied in his character and life the ideal perfection not only of his own age but of all time. Few other poets have attempted to do the kind of thing that Mr. Khalid has striven to accomplish. If communication is essential to the business of poetic creation - as the present reviewer suggests it is-- Mr. Khalid's success will depend on the earnestness with which his readers approach verses such as his. In its own right it is a grand achievement.

MENTAL CULTURE

ABDUL AZIZ KHALID

I very much wonder if we ever truly gauged the depth and extent of what the expression 'Mental Culture' connotes and signifies. Ever since our intellectual horizon began to shrink, we have unwittingly imbibed a pernicious attitued of accepting the contents of our experience almost naively and uncritically. We neither question their validity nor doubt their sanction. The very idea that these sacramental truths constituting our conscious sector can be submitted to a critical and reflective analysis, sounds sacrilegious to us. The result of this higgledy piggledy process has been simply self-annihilating.

We have forgotten that life is an active, positive and approaching adjustment, not a negative willy-nilly affair. Its essence lies in liberating our latent energies and in developing that earnest frame of mind which believes in still achieving and still pursuing. It is a perpetual struggle between the asserting self and the reluctant environmental forces buttressed by atavistic tendencies and multitudinous hereditary complexes and

idiosyncracies. Without this sense of strife and struggle, life becomes destitute of all content, bereft of all meaning.

The whole meandering course of our conscious life is to be inspired by a master motive, a Good will and a single Dominant Purpose, dovetailing all the various centripetal and centrifugal influences under a well-knit central organisation. Achievement is a function of ability plus motivation. We should face life boldly with confidence and pride and whole-heartedly share its banquet of gall and worm-wood, sweets and dainties. It does not yield its secrets easily; it has to be warmly wooed and devotionally humoured before it would yield with sweet amorous reluctance.

It is precisely this attitued which ought to be the main concern of a right type of a system of education. It should concentrate upon man in his entirety as a living, growing, expanding organism.

Life is not a comic interlude which has no design or purpose in it. Time has supplanted the slip-shod infantile theories, which regarded this Universe from a necessitarian deterministic point of view __________ a mere collocation of atoms-- a precarious biological development whose only raison d'etre was a mysterious Natural Selection. Man was a mere shuttle-eock propelled by blind forces, motivated by predestined ends. He had no free will. The scheme of things was inexorable and could not admit of any human dispensation. Acceptance of such a mechanistic view envisaged the corollary that responsibility was a figment, freedom a hoax.

Human conscience naturally rebelled against this. Man at last wriggled himself out of the tyranny which had almost stifled

the spontaneous expression of his personality. Life is a potentiality awaiting to realise itself into some manifest content. It is the unalloyed, pure and unbounded urge of creation, of perfection and realisation. And now the function of education is to train us to eagerly respond to this innate urge, to sally forth and meet our adversary in the open and to open out ever thrilling, ever-inspiring, intellectual and spiritual possibilities; not to stuff our minds with ageworn thoughts but to foster in us that essentially philosophic outlook, which enables and stimulates its recipients to contemplate the Universe as a unique whole, to perceive the vital unity underlying its apparent chaos.

This to my mind is the prime duty of education. It ought to be a matter of not sophistication but of consecration, of elevation and edification, of expansion and enlargement. It is so to say a three dimensional proposition embracing soul, body and mind in its caressing fold. It cannot afford to ignore one or the other without seriously imperilling its immediate efficacy and ultimate utility. We have long since forgotten this. Education and Life to us are not the two aspects of an inviolable whole supplementing and illuminating each other. Our educational curricula never helped an ambitious exuberant youth to face life with cheer, confidence and hopefulness. The moment he stepped out of the high sanctum, he found himself in a foreign land utterly incompatible with the sort of life he had been cherishing with so much relish and gusto. His ideal Republic proves for all practical purposes to be at loggerheads with an imperfect world, in which he has perforce to play his lifelong role. The Universe which we inhabit is a universe of low values. That mighty, moving sense of service and sacrifice never touches us, never enters our calculations. And to what consequence and to whose peril? We are fast approaching a state of cultural serfdom.

Free nations of the world hug their cultural heritage jealously to their bosom. They would rather renounce their colonial claims than part with a Shakespeare. And culture does not exist in the void. It is a live force and has to be kept alive by the life blood of a nation. And education is the channel through which the current runs.

Everything is not lost; still much can be done. Let us do our stocktaking and check how our assets and liabilities stand. What is our position vis-a-vis our debtors and creditors. The equilibrium must be restored. This requires a heart search. The task may be unpleasant but is inevitable. If we have to survive and with dignity and honour, we shall have to take up the gauntlet sooner or later. And the sooner the ordeal is faced the better.

(1951)

****

RICH, BOLD AND BEAUTIFUL

DR. ABULLAIS SIDDIQI

NA'T or poetry in praise of the Holy Prophet (Peace be upon him) has been a popular theme for our poets. Arabic, Persian, Turkish and Urdu writers have produced some outstanding poetry on the subject and such pieces as Qasida Burdah Shareef, the verses of Jami, of Mohsin Kakorvi and Ameer Minai are only a few examples. As a matter of fact , all Muslim poets have written about it and even some non-Muslims like the famour Lucknow poet Daya Shanker Naseem have incorporated it in their poetry.

However, only a few have tried to concentrate upon the theme and in the history of Urdu poetry, Mohsin and Ameer are two famous poets whose poetry in praise of the Holy Prophet deserves special mention. They have produced poetry, which when judged from the criteria of their age, is definitely perfect. Later on various factors contributed towards a decay and degeneration and the tradition was lost.

Farqaleet is a long narrative poem by Abdul Aziz Khalid, a well-known literary figure. His earlier works include Sarod-i-Kafta, Ghazalul Ghazlat, Dukan-i-Shishagar, Gul-i-Naghma, Zar--i-Dagh--i--Dil etc. In his poetry Khalid combined the richness of classical tradition with the boldness of experiment.

MODERN URDU POETS   ABDUL AZIZ KHALID

A GREAT POET BY VIRTUE OF HIS ENERGY OF EXPRESSION

BY YUNUS AHMAR

ONE of the most talked about and bitterly criticised among modern Urdu poets for his difficult expressions and the plethora of self-consciously archaic words is no other than Abdul Aziz Khalid who has by now nearly thirty collections of poems to his credit. Apart from his creative writings, he has also enriched Urdu literature by translating some of the world famous classics into Urdu. Does he use difficult words of Persian and Arabic deliberately or do they come spontaneousl· This is a question in the light of which we are to analyse his writings.

While giving his opinion, one of the Urdu critics has passed sweeping remark about his poetry. He says: "There is no doubt that Khalid Saheb is the only Urdu poet of his style; no one other than him has written poems with the help of Arabic words. The use of these words is not artistic. The reason for this is that there exists a learned man in him but not an artist". Apparently this sounds plausible but the fact is not so. My intention is not to support Khalid without any reason. He is a learned man beyond any shadow of doubt. There can also be no two opinion on the content and diction that he has given to Urdu poetry. The canvas of his poetic life is so vast and wide that one

wonders where does his individuality lie. In this context I am reminded of T.S. Eliot's views on the writings of Ezra Pound. He says: "Pound's erudition has been both exaggerated and irrelevantly under estimated for it has been judged chiefly by scholars who did not understand poetry, and by poets who have had little scholarship". So is the case with Khalid. He has been misjudged and misunderstood. Since he is a scholar of Persian, Arabic, Greek and Latin literature and has gone into the treasure of these languages, the words, idioms and phrases that he uses flow spontaneously. Like Pound, Khalid also feels that a poet who knows only the poetry of his own language is as poorly equipped as the painter or musician who knows only the painting or the music of his own country. His knowledge of Persian, Arabic, Greek, Latin and Sanskrit has, therefore, contributed a great deal in enriching our own literature. The arduous task of translating great classics of the world that he undertook speaks of his impetuous mind and his vision. He has so dexterously and artistically translated the Greed Poetess Sappoh that in the words of critic like Uslob Ahmad Ansari "it has become a beautiful bunch of flowers".

Khalid is often described as a poet without lucidity and music. This is not true. When he writes on love, music and other aesthetic arts, it appears as if he has a full grip on such subjects. The following verses of his different Ghazals fully relect the fire of love that is burning in his heat:

(The fragrance of distance flows
with the wind
The enite abode is emitting
odour of old memories.)